کراچی

آئندہ

محمود واجد

rekhta

آئندہ

کراچی

مدیر: محمود واجد

Aainda Karachi.
e-mail aaindakarachi@yahoo.com
Fax : 092-21-2214040
Ph: 2626516, 2624040
Residence: 465571
Mobile:0300-2244866

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:
ہاشمی ٹریڈنگ
عقب الیکٹرک مارکیٹ
آرام باغ
کراچی۔ ۷۴۲۰۰
(پاکستان)

rekhta

جلد:۱۱ شمارہ:۴۲ اپریل تا جون ۲۰۰۶ء

آئندہ

کراچی

مدیر: محمود واجد
معاون مدیر (پاکستان): سائرہ غلام نبی
آرٹ ورک: آصف جمیل

مدیر انتظامی: ممتاز ہاشمی
معاون مدیر برائے (ہندوستان): ارمان نجمی
کیلی گرافی: سلیم کوثر

عام شمارہ : ۵۰ روپے
صفحات : ۱۶۰
سالانہ قیمت : ۲۰۰ روپے (چار شمارے)
خاص نمبر : ۳۲۰ صفحات
قیمت : ۱۲۰ روپے

بیرون ملک......(سالانہ)

بھارت / بنگلہ دیش (بشمول ڈاک خرچ): ۳۲۰/روپے
سعودی عرب (بشمول ڈاک خرچ) :۱۰۰/ریال
متحدہ عرب امارات (بشمول ڈاک خرچ): ۱۰۰/درہم
یورپی ممالک (بشمول ڈاک خرچ) : ۱۶/پونڈ
امریکہ و دیگر (بشمول ڈاک خرچ) :۲۵/امریکی ڈالر

rekhta

تفصیل

تحریریں	عنوانات	صفحہ

اظہار

اداریہ	ہم کیا رک گئے ہیں ؟	۷
اداریہ	اور یہ شماریہ	۸

عقیدت

یعقوب تصور	حمد	۹
محمد فیروز شاہ	نعت	۱۰
نجم عثمانی	نعت	۱۰

ترسیل

جمیل آذر	اردو کی ایک اہم ادبی اوڈیسی	۱۱
قیصر تمکین	فکشن نگاری۔ ایک لمحۂ فکریہ	۱۹
ناصر بغدادی	انتظار حسین کی افسانہ نگاری	۲۹
ہمایوں اشرف	منٹو کے مضامین	۳۷
مریم حسین	تقابلی جائزہ: احمد ندیم قاسمی اور شوکت صدیقی	۵۲

نظمیں

منیب الرحمن	قمقمے جل گئے	۶۲
ادیب سہیل	ابرِ نسیاں کا احسان بڑا	۶۲
مظہر امام	اشتراک / حیات آوارہ	۶۳
علقمہ شبلی	یہی اب سوچتا ہوں	۶۴
نصیر احمد ناصر	کچھ کتبوں پر نام نہیں ہوتے	۶۴
ارمان نجمی	صحرا	۶۵
صلاح الدین پرویز	ایک بے وفا کے لئے!	۶۶

ناصر بغدادی

انتظار حسین کی افسانہ نگاری۔ ایک تنقیدی مطالعہ

یہ بھی ایک دلچسپ ادبی حقیقت ہے کہ محمد حسن عسکری نے ۱۹۵۲ء میں انتظار حسین کی افسانہ نگاری کی بابت جن افکار و آرا کا اظہار کیا تھا، ان کی معروضیت، منطقیت اور صداقت سے آج بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ عسکری صاحب نے کہا تھا:

> ''انتظار کی کتاب بند کرنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ اس میں کتنے افسانے ہیں کیونکہ سبھی افسانوں کی فضا، کردار، مکالمے بالکل ایک ہی جیسے ہیں۔''
>
> ''انتظار انفرادی کرداروں کے بجائے ایک ٹائپ پیش کرتے ہیں یا چند ٹائپ۔ پلاٹ تو خیر ان کے افسانوں میں ہوتا ہی نہیں، لیکن جو تھوڑا بہت عمل ان کے یہاں نظر آتا ہے، اس میں بھی فی الجملہ یکسانیت ہے۔''[1]

حمید نسیم کا بھی خیال ہے کہ انتظار حسین کے ''افسانوں میں کہانی کم ہی کبھی نظر آئی۔ ہر افسانے کے مطالعے کے بعد یہ معلوم نہ ہوا کہ کہانی کیا تھی''[2]۔ اصلاً انتظار صاحب ان گنے چنے اردو نثر نگاروں کی صف میں شامل ہیں جنھوں نے صحیح یا غلط یہ سمجھا ہے کہ اردوئے معلی میں دسترس حاصل کرنے سے تخلیقی جوہر کی کمی دور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن افسانہ نگاری میں نقطۂ کمال تک پہنچنے کے لیے محض زبان دانی ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اس مخصوص صنف میں استناد و اعتبار صرف اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو لسانی مہارت، زبان آوری اور صاحب اسلوب ہونے کے ساتھ وسیع المطالعہ بھی ہو اور جس کی تحریروں میں اپنے دور کے تغیر پذیر واقعات اور وارداتوں کی جھلکیاں بھی استعاراتی علائم سے ہاتھ ملاتے ہوئے مسلسل تاک جھانک کرتی نظر آتی ہوں۔ دوسرے الفاظ میں جس کا فن عصری حسیت کے انعکاسات سے ممزوج ہو کر بوقلموں جہتوں کی نشان دہی کرتا ہو۔ انتظار حسین نے شروع ہی سے ان فنی و تکنیکی پہلوؤں کو افسانہ نگاری کے لیے قابل اعتنا نہیں سمجھا اور عالمی ادب کے وسیع ترین کینوس کو فکشن کی اساس بنانے کی بجائے بودھ جاتکوں، بیتال پچیسی، ہندو دیومالائی کتھاؤں، کتھا سرت ساگر، عہد نامہ عتیق کی تمثیلی حکایت، الف لیلوی داستانوں اور قدیم اساطیری قصص کے گنبد بے در میں بیٹھ کر ایک فرسودہ آرکی ٹائپ کو تر

rekhta

جال بنائے رکھا۔ چونکہ موضوعات کے حوالے سے انتظار صاحب کا فنی کینوس بڑا محدود ہے، یہی وجہ ہے کہ عسکری صاحب نے ان کے سارے افسانوں کو ایک دوسرے سے مختلف نہیں کہا ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ انتظار صاحب اپنے کسی بھی کردار کو کسی بھی انداز سے کوئی بھی مکالمہ کہلوا لیں، وہ ان کے دوسرے افسانوں کے مرکزی کرداروں کے روپ میں قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ یک رنگی طرز تحریر، یہ پامال اسلوب، یہ فنی سقم ان کے صحافتی کالموں کو تو شاید قاری کے لیے قابل برداشت بنائے رکھے لیکن فکشن کا باخبر قاری اس کے چنگل میں زیادہ دیر تک نہیں پھنس سکتا۔

ایک جینوئین، صاحب طرز فکشن نگار محض واقعات کی تبدیلی کے ساتھ ہر مرتبہ اپنے ہر افسانے میں ایک جیسے کردار کو تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ پیش نہیں کرتا۔ ممکن ہے اس قسم کے کسی قسط وار ٹی وی کے پروگرام سے ناظرین کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کیا جاسکے لیکن اساطیری واقعات، نوسٹلجیائی تصورات اور ماضی سے متعلق انعکاسات کو بار بار، بلاضرورت استعمال کرنے سے فکشن نگاری کے فن کو وقیع اور باثروت نہیں بنایا جاسکتا۔ انتظار صاحب نے بھی فکشن کے ان حساس، نازک فنی پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے زیادہ تر افسانوی کردار اپنا چہرہ بدلنے پر قادر نہیں، انتظار صاحب اپنے مختلف افسانوں میں انھیں مختلف ملبوسات پہنا کر قارئین کے سامنے لاتے رہے ہیں۔ اب پتہ نہیں انتظار صاحب اپنے اس متغائر اسلوب کی اختصاصیت کو کس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مکالموں اور پیرہن کی تبدیلی کے باوصف ایک قاری نہ صرف بہ آسانی ان افسانوں کی مخصوص فضا اور کرداروں کی یک رنگ طرز ادا محسوس کرتا ہے بلکہ ناخوشگوار تکرار سے بھرپور یکسانیت کے باعث اس کی دلچسپی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یوں عسکری صاحب کا یہ تجزیہ صحیح ثابت ہو جاتا ہے کہ انتظار حسین کے ہر افسانے پر ان کے دوسرے افسانوں کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے۔

فکشن کے بعض نقادوں نے انتظار حسین کے جن افسانوں کو "ماضی کا شاندار مرثیہ" کہا ہے، اصلاً ان میں وہ اپنے بزرگوں کے زاد بوم کو تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھیں ماضی کے کھنڈرات میں بھٹکتے ہوئے روحانی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ایک Forward looking تخلیق کار نہیں کیونکہ انھیں لمحہ موجود اور مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ "جڑوں کو تلاش" کرتے ہوئے ماضی بعید کے کھنڈرات کو اپنا تخلیقی مسکن بنانے کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔ اس قدر بسیار نویسی کے باوجود ان کی تحریروں میں مستقبل اور آنے والی نسلوں کے متعلق کوئی خوش آئند بشارت نہیں ملتی۔ ان کے معتقدات، ان کی زندگی کے سارے سروکار کا تعلق صرف اور صرف ان کے بزرگوں کا وہ ماضی ہے جس کی طرف مراجعت کو وہ تخلیقیت کا حاصل سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے تخلیقی سفر کو ادھورا اور کبھی لاحاصل سمجھتے ہیں کیونکہ انھیں خوب علم ہے وہ حال اور مستقبل کو اپنے بزرگوں کے ماضی کا چربہ (Replica) بنانے پر قادر نہیں۔ اس سلسلے میں انتظار صاحب کے ان الفاظ کو خود وضاحتی (Self explanatory) کہنا

مبالغہ نہیں:

''اولاد نے باپ کی تکلیفوں سے فیض اٹھایا مگر اس اولاد میں سے جس نے تخلیقی آدمی بننے کا دعویٰ کیا اس کے سر پر یہ بوجھ ڈالا گیا کہ وہ اپنے جدِ امجد کی تکلیفوں کو امانت جانے اور ان سے [illegible] فراموش نہ ہونے دے۔''۳

انتظار صاحب کے ان الفاظ کو منطقیت کے مقیاس سے پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا فن شدید ترین ناسٹلجیائی رجحانات سے مشتق ہے اور ماضی کی بازیافت ان کا مقصدِ حیات۔ چونکہ انھیں تخلیقی آدمی بننے کا بھی دعویٰ ہے اس لیے ان کا ''تصور اعتقاد'' انھیں اپنے اجداد کی تکلیفوں کو مقدس امانت تصور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ان تکالیف کو فراموش کرنا ان کے نزدیک نہ صرف بعید از قیاس ہے بلکہ شاید گناہِ کبیرہ بھی۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں گزرے ہوئے زمانوں کی بازیافت کی خواہش، تہذیبی ورثے اور معتقدات کے تحفظ کا عمل اور داستانوں کی غیر حقیقی دنیا میں پہنچنے کا رجحان پوری شدومد کے ساتھ نمایاں ہے۔ ان کی تحریروں میں نقل مکانی، ہجرت اور بے زمینی کے گوشوں کی عکاسی ارضی حقائق سے مطابقت رکھنے کی بجائے خیالی صورت گری کے پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ انتظار صاحب کے ان تخلیقی رویوں نے ان کے افسانوں میں انفعالیت کے تاثرات پیدا کر دیے ہیں اور ان کے مطالعے سے قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مذہبی اساطیری تصور کی بنیاد پر لکھی ہوئی غیر حقیقی داستانوں کا مطالعہ کر رہا ہے۔ ان میں تخلیقی معروضیت کے پہلوؤں کو تلاش کرنا ایک لاحاصل عمل سے زیادہ نہیں۔ ان کی اکثر کہانیوں کی منصوبہ بندی کو روایتی اور مذہبی داستانوں، اساطیری کتھاؤں، عہدِ عتیق کے قصص کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کہنا زیادہ مناسب ہے۔

انتظار حسین کا المیہ یہ ہے کہ ان کے بزرگوں کی طرح انھیں بھی اپنے زاد بوم کو چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ چونکہ ان کے آبا و اجداد کا ماضی ان کے لیے مقدس ترین میراث کا درجہ رکھتا تھا اس لیے بلا جواز انتہا پسندی کے زیرِ اثر انھوں نے اس میراث کی حفاظت میں اپنی زندگیاں گزار دی تھیں۔ قسمت نے انتظار صاحب کو بھی اپنے بزرگوں کی طرح گھربار چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اس لیے وہ بھی اپنے اور بزرگوں کے مشترکہ ماضی کے تحفظ کو تخلیقی اعتبار سے یقینی بنانے کے عمل میں مصروف ہیں۔ عسکری صاحب نے صحیح کہا تھا کہ انتظار صاحب کو ''ایک حادثے نے افسانہ نگار بنا دیا۔ چنانچہ اب یہ ان کے لیے ناممکن ہو گیا ہے کہ یادوں کو یادیں نہ سمجھ کر افسانہ لکھیں۔ اس چیز نے ان کی کہانیوں میں ایک اضمحلال، ایک بڑھاپا سا پیدا کر دیا ہے۔''۴

اگر انتظار صاحب ہجرت کی یادوں اور اپنے بزرگوں کی تکلیفوں کو فراموش کر کے افسانہ نگاری کا ڈول ڈالتے تو اردو ادب میں ایک بے عدیل فکشن نگار کی حیثیت سے اپنی تخلیقیت کا لوہا منوا سکتے تھے، لیکن ان کے فلسفہ

اعتقاد کے مطابق بزرگوں کی صدیوں پرانی تکلیفوں کو مسلسل یاد رکھنا ایک مقدس مذہبی فریضہ تھا۔ اس لیے ماضی بعید اور ماضی قریب کی یادوں کو حرزِ جاں بنائے رکھنا ان کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی افسانہ نگاری انفعالیت کے زیرِ اثر بوجھل ہو کر رہ گئی ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کا کہنا ہے کہ "انتظار حسین کا بنیادی تجربہ ہجرت کا تجربہ ہے"۔ ڈاکٹر صاحب کی اس بات سے انکار نہیں لیکن یہ پورا سچ نہیں کہ انتظار صاحب اپنے عہد سے زیادہ اپنے بزرگوں سے نسبت کو اہمیت اور ان سے فیض پانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جس طرح یہودیوں نے تالمود (Talmud) کی چھتیس (۳۶) جلدوں کو کبھی فراموش نہیں کیا ہے، اسی طرح آباؤ اجداد کی ہجرت کے حوالے سے جو واقعات و تجربات انتظار صاحب کو وراثت میں ملے تھے ان سب کو انھوں نے احتراماً اپنے سینے میں محفوظ کر رکھا ہے۔ اور وہ اپنی تخلیقات میں ماضی پرستی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عہدِ حاضر نے ان کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھا ہے بلکہ ان کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے بزرگوں کے المناک تجربوں کی فراموشی کو خود پر حرام کر رکھا ہے۔ ایک لحاظ سے ان کا تخلیقی رویہ ایک سخت گیر تالمودی (Talmudist) سے مختلف نہیں جو عہدِ حاضر کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں ہزاروں سال پرانے تالمودی فقہ سے رجوع کرتا ہے۔[۹]

انتظار صاحب کے افسانوں کا ایک کلیدی پہلو سفر بھی ہے جو انھیں یادوں اور خیالوں کی بنیاد پر توہمات و اعتقادات سے لبریز ماضی کی بستی میں پہنچا دیتا ہے۔ اگرچہ انتظار صاحب جانتے ہیں کہ صدیوں کی مسافت کی بدولت حقائق کا چہرہ دھند میں ملفوف ہو چکا ہے اور بزرگوں کے تجربات کو امتدادِ زمانہ نے کسی اور رنگ میں ان کے حوالے کیا ہے لیکن انھیں اس بات کی مطلق پروا نہیں کہ اصل حقیقت کیا تھی۔ اگرچہ وہ جڑوں کی تلاش میں مصروف نظر آتے ہیں لیکن اصلاً یہ تلاش تخلیقی نہیں محض جذباتی ہے کہ تحقیقی معیاروں کو بالائے طاق رکھ کر وہ اعتقادات، توہمات اور داستانی و مذہبی روایات کے سہارے پچھلے ساٹھ برسوں یا اس سے زیادہ عرصے سے اپنا تخلیقی کاروبار چلا رہے ہیں۔ انتظار صاحب کا دعویٰ ہے کہ "افسانے میں میرا مسئلہ ظاہر ہونا نہیں ہے، روپوش ہونا ہے۔" لیکن اس کو ایک استعجابی حقیقت کہنا زیادہ مناسب ہے کہ انتظار صاحب کے افسانوں کے مطالعے کے بعد ان کی ساری شخصیت، ان کے مخصوص اسلوبِ نگارش، ان کے خاص الخاص نقطۂ نظر، ان کے بنیادی تعصبات و اعتقادات کے حوالے سے برہنہ ہو کر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ "کایا کلپ" بہ تمام و کمال کافکا کے شہرۂ آفاق افسانے Metamorphosis سے ماخوذ ہے۔ خود نارنگ صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ "بظاہر کایا کلپ کا نام ہی کافکا کی Metamorphosis کی یاد دلانے کے لیے کافی ہے، اور اتنی بات معلوم ہے کہ انتظار حسین کافکا سے متاثر ہیں"[۸] لیکن انتظار صاحب اپنے اس افسانے کو طبع زاد سمجھنے پر مصر ہیں کیونکہ انھوں نے کسی موقع پر اعتراف نہیں کیا کہ "کایا کلپ" کا

مرکزی خیال ماخوذ ہے، اگرچہ انھوں نے تمثیلی انداز اختیار کر کے کہانی کو ایک ایسی جہت سے روشناس کرانے کی کوشش ضرور کی ہے جس سے ایک مختلف مفہوم متبادر ہو سکے۔ لیکن انتظار صاحب بد قسمتی سے اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ کافکا کے افسانے کا گریگر سیمسا صبح بیدار ہوتا ہے تو خود کو ایک دیوہیکل کیڑے کی جون میں پاتا ہے جبکہ انتظار حسین کے ''کایا کلپ'' کا شہزادہ آزاد بخت صبح مکھی کی صورت میں کرتا ہے۔ اس قدر بدیہی مماثلت کے باوجود نارنگ صاحب کا یہ کہنا کہ انتظار صاحب محض کافکا کے افسانے سے متاثر ہیں، یقیناً کافکا کے ساتھ ایک ادبی زیادتی ہے۔ اصلاً کافکا کا افسانہ معاشرتی زندگی کے سیاق وسباق میں انسانی خود غرضی، مطلب پرستی اور ابن الوقتی کے احساسات کو بڑے موثر انداز میں اجاگر کرتا ہے جبکہ انتظار صاحب نے اپنے افسانے میں دہشت وخوف کی فضا تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔ فی الحقیقت ''کایا کلپ'' خوف کی کہانی نہیں (جیسا کہ نارنگ صاحب نے کہا ہے) بلکہ بزدلی کی کیفیت کو پیش کرتی ہے کہ زندہ رہنے کے لیے جون بدلنے کی ضرورت پیش آئے تو جون بدل لو چاہے مکھی کی جون میں ہی کیوں نہ زندگی گزارنی پڑے۔ انتظار صاحب کے لیے ضروری نہیں تھا کہ اپنے اس تخیلی موقف کو پیش کرنے کی خاطر وہ کافکا کی قبر میں نقب زنی کے مرتکب ہوتے، وہ اپنے اس فکری نکتے کو کسی طبع زاد پلاٹ کے حوالے سے بھی پیش کر سکتے تھے۔ انتظار حسین کے اچھے افسانوں میں ''آخری آدمی'' سر فہرست ہے اور بد قسمتی سے ان کا یہ افسانہ بھی آئینسکو کے ڈرامہ Rhinoceros کی زیراکس کاپی ہے۔ ہم اس پر اس لیے بحث نہیں کریں گے کہ یہ موضوع ایک سیر حاصل مضمون کا متقاضی ہے۔ بہرحال اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انتظار حسین صاحب نے ''کایا کلپ''، ''آخری آدمی'' اور ''زرد کتا'' جیسے افسانوں میں جن داستانی اور اساطیری علامتوں کا سہارا لیا ہے وہ ان افسانوں کے کرداروں اور ماحول کی سیال کیفیات کو پیش کرنے میں کامیاب نہیں۔ انتظار حسین کی فنی کمزوری کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ دیومالائی داستانوں کے تاریک گنبد بے در میں چکر کاٹتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ موضوعات کی دنیا ختم ہو گئی۔ آج انسانی مسائل کی پیچیدگی اور تہہ داری کے پس منظر میں داخلی اور خارجی عوامل کے امتزاج کی بنیادوں پر نئے تصورات اور رجحانات سے متعلق موضوعات کی سرحدیں وسیع تر ہوتی جا رہی ہیں۔ انتظار حسین کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تو بالک ہٹ کی مثال بن کر نئی دریافتوں کی چھان بین کی بجائے ماضی کی بازیافتوں پر مصر ہیں۔

برصغیر کی تقسیم نے اس خطے کی زمین کو لہو رنگ کر دیا تھا اور انسان نے درندے کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ اس عظیم المیے نے کوئی خاندان ایسا نہیں چھوڑا تھا جس کے افراد کسی نہ کسی قریبی رشتے دار یا دوست کی موت، گم شدگی یا جدائی کو یاد کرتے ہوئے اشکباری میں مصروف نہ ہوں۔ اس دور میں منٹو نے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''کھول دو'' جیسے افسانے لکھ کر آزادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انسانی بربریت اور نفسیاتی پیچیدگیوں کی متغائر جہتوں سے اردو

فکشن کو متمتع کیا تھا تو احمد ندیم قاسمی نے "پرمیشر سنگھ" لکھ کر ثابت کر دیا تھا کہ جینوین تخلیق کار روحِ عصر کے جبر سے آزادی حاصل نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں شاید ہی کوئی ایسا فکشن نگار رہا ہو جس نے اپنی تحریروں میں آزادی کے حوالے سے انسانی ذہن کی بوقلموں کیفیات کو اجاگر نہ کیا ہو۔ لیکن انتظار حسین کی صحت فسادات کی طرف سے بالکل متاثر نہیں ہوئی تھی۔ انھیں اس بات کا مطلق غم نہیں تھا کہ انسانی ورندگی کے باعث آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی لیکن یہ احساس انھیں گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا کہ اس تقسیم کی بدولت لکھنؤ کے محرم کلچر کا منضبط نظام بکھر کر رہ گیا تھا۔ انتظار صاحب نے ایک جگہ اپنے کرداروں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "حادثے مجھ پر اثر نہیں کرتے۔"[۹]۔ اگرچہ راقم ان کی اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ حادثوں سے اثر پذیر ہوئے بغیر افسانہ نگاری کس طرح ممکن ہے؟ لیکن جب وہ اپنے کسی ایسے کردار کی سائیکی سے بحث کرتے ہیں جس کو یہ دکھ ہو کہ پاکستان کے وجود نے امام باڑے کا کلچر ختم کر دیا ہے تو ہم سمجھ جاتے ہیں کہ انتظار صاحب پر کس قسم کے حادثات اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اس موضوع پر انتظار حسین کے خیالات معلوم کرنے کے لیے ان کے "پھر آئے گی" اور "آخری موم بتی" جیسے کئی افسانوں کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

اگر انتظار حسین کی ادبی زنبیل سے لوک کتھائیں، اساطیری قصص، مذہبی حوالے اور عہد قدیم کی داستانوں کو نکال دیا جائے تو ان کے پاس تخلیقیت نام کی کوئی شے باقی نہیں رہتی۔ آج کا تخلیقی آدمی حیات و کائنات کا وجدان رکھتے ہوئے اس حرکی دنیا کے بدلتے ہوئے تناظر کا بھی ادراک رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آج وہ کوئی الف لیلوی کردار نہیں کہ کوئی غیر ماورائی قوت اس کے مسائل کا حل پلک جھپکتے ہی کر دے۔ آج چراغ کے جن کا کہیں وجود نہیں جو اپنے آقا کو گوشۂ عافیت میں بٹھا کر اس کی لایعنی خواہشات کی تکمیل میں خود کو وقف کر دیتا تھا۔ آج زندگی کی مادی ارتقا پذیری کسی بوتل یا چراغ کے جن کی مرہونِ منت نہیں بلکہ اس کے لیے ہر شخص کے لیے سخت گیر حالات کی خارا شگافی سے نبرد آزمائی لابدی ہے۔ آج خواب دیکھنے والا زندہ تو رہ سکتا ہے لیکن زندگی اس کو فلسفۂ عدمیت کی طرح خوفزدہ کر دیتی ہے۔ یہ دور ابتلا مہاتما بدھ کا دور نہیں کہ چھتنار برگد کی چھاؤں میں بیٹھنے سے کسی کو نروان حاصل ہو جائے۔ آج افسانے کا قاری ایسے موضوعات کو پسند کرتا ہے جن میں حقیقی زندگی کے سفاک پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ وہ تخلیقی افسانوں کے مطالعے کے دوران ان کرداروں سے متعارف ہونا چاہتا ہے جو اس حقیقی دنیا کے مسائل اور اس کے لامحدود امکانات کا استعارہ بن کر ہمارے سامنے پیش ہوں۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر کسی قاری کو عہد عتیق کے قصص یا اساطیری موضوعات سے دلچسپی ہو تو اس کے مطالعے کے لیے اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ وہ شاید اپنی زندگی میں اس کا ایک فیصلہ بھی ختم نہ کر سکے۔ ہر الوہی مذہب کی اپنی ایک مقدس کتاب ہے جس کے بعض قصص اس قدر دلچسپ، دل پذیر اور سبق آموز واقع ہوئے ہیں کہ قاری محویت کے عالم میں اپنے آپ کو فراموش کر سکتا ہے۔ ان قصص کے کردار بھی اثبات و نفی کے حوالے سے اس قدر جاندار، متنوع اور

فکری قوتوں کے مظہر ہوتے ہیں کہ توجہ ایک خاص نقطے پر منجمد کر رہ جاتی ہے۔ جب اساطیری ادب اور مذہبی و غیر مذہبی داستانوں کا کوہِ ہمالہ قاری کے سامنے کھڑا ہو تو اسے اصل یا خلقی مسودوں کو چھوڑ کر ادب کے نام پر چربے یا ماخذات کی طرف جانے کی کیا ضرورت ہے؟

اردو ادب کا کوئی نقاد اس بدیہی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ انتظار حسین دورِ حاضرہ کے حوالے سے ایک حقیقی تخلیق کار کی تخلیقی انفرادیت، فکری اُپج اور ارضی حقیقت پسندی سے کلیتاً محروم ہیں۔ چونکہ ان کی افسانوی تحریروں کا سرچشمہ عہدِ عتیق کی نوشتہ یا غیر نوشتہ قصص ہیں یا مذہبی اور غیر مذہبی داستانیں ہیں اس لیے افسانہ نگاری، طرزِ فکر میں خلقی (original) ہونے کی بجائے ماخوذ اور غیر طبع زاد ہے۔ ان کے بعض افسانوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے انھوں نے کتر بیونت اور قطع و برید کے بعد حسبِ منشا اساطیری مواد کو افسانوی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہو۔ اگرچہ ہیئت و اسلوب کے فن کارانہ ستعمال اور زبان کی ماہرانہ طور پر برتنے کی وجہ سے انتظار صاحب کے بعض افسانے قاری کو متاثر بھی کرتے ہیں لیکن چونکہ نقل اصل کی فطری حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا اس لیے ان کی بہت سی تحریریں اس تخلیقی و فنی سقم سے مبرا نہیں۔

انتظار صاحب کی فکشن نگاری کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ ان کے یہاں انسانی زندگی کی ارتقا پذیری اور اس سلسلے میں پیدا ہونے والے مسائل کی رنگارنگی، بوقلمونی اور ہمہ گیری کے انعکاسات کو اجاگر کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ ان کے بہت سے کردار جب ماضی کے کھنڈرات میں بھٹکتے ہیں تو افسانے کی فضا میں خواب ناکی تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن ارضی حقائق کے سیاق و سباق میں ان کی تحریر تصنع سازی اور بناوٹ سے متصف ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایسی تخلیقات کو پڑھ کر قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے تخلیق کار ایک ایسے موذی مرض میں مبتلا ہو جس کے سبب وہ ماضی کی تمام تر یادوں کی جزئیات کے ساتھ تو یاد رکھ سکتا ہے لیکن لمحۂ موجود کے اسٹیج پر زندگی کا جو کھیل تماشا جاری ہے اس کی بابت اسے مطلق کچھ علم نہیں، حالانکہ وہ خود بھی اس ڈرامے کا ایک کردار ہے۔ انتظار صاحب کے بیشتر افسانوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا کبھی باعمل، سرگرم زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا ہو، اور انھوں نے مجہول اور منفعل حالت میں ماضی کی یادوں اور واقعات کو ہی حرزِ جاں بنائے رکھا۔ ان کی ان کل وقتی مصروفیات نے ان کو ماضی کے کابوس کے بوجھ سے گراں بار تو کر دیا لیکن ان کی سوچ زمینی تگ و تاز اور مسائل کے تناظر میں زندگی کی حقیقتوں کو پرکھنے میں بری طرح ناکام رہی۔ شاید اسی وجہ سے عسکری صاحب نے کہا تھا کہ "انتظار کے کرداروں کی شخصیت اتنی مضبوط نہیں کہ گرد و پیش کی تبدیلیوں کا مقابلہ کر سکے[۱۰]"۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ان کرداروں میں قوتِ مدافعت نہیں اور نہ یہ خود کو بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگی پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سخت گیر حالات کی چکی میں بری طرح پس کر رہ جاتے ہیں۔ عسکری صاحب نے ۱۹۵۲ء میں انتظار صاحب کے افسانوں کا جو تجزیہ پیش کیا تھا اس کی سچائی کو آج بھی کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ عسکری صاحب کے الفاظ

ملاحظہ ہوں:

> ''افسانوں کے جس حصے میں انتظار رونے رلانے کا بندوبست کرتے ہیں، وہ نہ تو المیہ ہے نہ رزمیہ۔ محض سوز خوانی ہے۔ انتظار کے کردار ہی ایسے ہیں جو صرف سازگار ماحول میں ہی پنپ سکتے ہیں۔ ان میں اتنی جان نہیں کہ اپنا ماحول خود بنا سکیں۔''[۱۱]

جب عسکری صاحب انتظار حسین کے افسانوں میں سوز خوانی کا تذکرہ کرتے ہیں تو شاید اس سے ان کی یہ مراد ہو کہ انتظار صاحب نے اردو فکشن میں رثائی میلانات کو متعارف کرانے کا بنیاد گزارانہ کارنامہ بھی انجام دیا ہے۔

☆☆☆

حواشی

[۱] محمد حسن عسکری۔ ''انتظار حسین کے افسانے''، ماہنامہ ''ساقی''، کراچی۔ جولائی، اگست ۱۹۵۲ء

[۲] حمید نسیم۔ ''انتظار حسین کی اردوئے معلّٰی'' سہ ماہی ''بادبان'' کراچی۔ شمارہ نمبر ۵

[۳] انتظار حسین ''اپنے کرداروں کے بارے میں'' جنم کہانیاں (کلیات)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۱۰۸۷ء۔ ص: ۷۵۰

[۴] محمد حسن عسکری: ''انتظار حسین کے افسانے۔'' ایضاً

[۵] ڈاکٹر گوپی چند نارنگ: ''انتظار حسین کا فن۔ متحرک ذہن کا سیال سفر'' (اردو افسانہ: روایت اور مسائل)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۱۹۸۶ء۔ ص: ۵۲۳

۶۔ تالمود (Talmud)۔ یہودیوں کی فقہ کا مجموعہ

[۷] انتظار حسین۔ ''اپنے کرداروں کے بارے میں۔'' ایضاً۔ ص: ۷۵۱

[۸] ڈاکٹر گوپی چند نارنگ: ''انتظار حسین کا فن۔'' ایضاً۔ ص: ۵۳۸

[۹] انتظار حسین: ''اپنے کرداروں کے بارے میں۔'' ایضاً۔ ص: ۷۵۰

۱۰۔ محمد حسن عسکری: ''انتظار حسین کے افسانے''، ایضاً

[۱۱] محمد حسن عسکری، ایضاً

E-2,8/14,Maimar square,Block:14,
Gulshan-e-Iqbal, Karachi-75300

rekhta

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081